

دینی مدارس، بنیاد پرستی اور انسانی حقوق

روزنامہ جنگ لاہور ۴ دسمبر ۹۴ء کے مطابق گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین نے دینی مدارس کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور فرقہ وارانہ کردار کے حامل مدارس کی بندش کا عندیہ دیا ہے۔ اسی طرح بعض اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی وزارت داخلہ نے ملک میں نئے دینی مدارس کی رجسٹریشن اور پرانے مدارس کی رجسٹریشن کی تجدید کے لیے وزارت داخلہ سے پیشگی اجازت کی شرط عائد کر دی ہے اور متعلقہ حکام کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اس اجازت کے بغیر کسی نئے دینی مدرسہ کو رجسٹرڈ نہ کیا جائے اور نہ ہی پہلے سے قائم کسی مدرسہ کی رجسٹریشن کی تجدید کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی بہاول پور پولیس کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکام بالا کی ہدایت پر پولیس دینی مدارس کا سروے کر رہی ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت معلوم کی جاسکے کہ بعض مدارس میں بچوں سے جبری بیگاری جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ دنوں گوجرانوالہ میں وزیر اعظم پاکستان کے ایک مشیر نے کسی مدرسہ کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کا ذکر کیا ہے کہ وہاں طلبہ کو زنجیروں سے باندھ کر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے بقول وزیر اعظم نے اس سلسلہ میں انکوائری کی ہدایات جاری کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ اینٹی انٹرنیشنل کے بارے میں بھی یہ خبر سامنے چکی ہے کہ اس نے پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ پر مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالہ سے تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔ دینی مدارس کے بارے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس تحقیقاتی مہم کا پس منظر کیا ہے اور یہ سب کچھ کن مقاصد کے لیے کیا جا رہا ہے؟ اس سوال کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے خلاف اس مہم کے مقاصد کو صحیح طور پر سامنے لایا جاسکے۔

پاکستان، بلکہ ویش اور بھارت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے دینی مدارس و مکاتب کا موجودہ نظام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل پورے برصغیر میں درس نظامی کا یہی نصاب تعلیمی اور ادارہ تھا۔

تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا اور جو اب بھی ہمارے دینی مدارس میں بدستور رائج چلا آرہا ہے۔

فارسی اس دور میں سرکاری زبان تھی اور عدالتوں میں فقہ حنفی رائج تھی، اس لیے درس نظامی کا یہ نصاب اس دور کی دفتری اور عدالتی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور دینی تقاضوں کی تکمیل بھی اس سے ہو جاتی تھی۔ اس لیے اکثر و بیشتر مدارس کا نصاب یہی تھا اور تقریباً تمام مدارس سرکار کے تعاون سے بلکہ سرکار کی بخشی ہوئی زمینوں اور جاگیروں کے باعث تعلیمی خدمات سرانجام دیتے چلے آ رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد جب دہلی کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہ راست تاج برطانیہ کو منتقل ہوا اور باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو سرکاری زبان فارسی کی بجائے انگریزی کر دی گئی اور عدالتی نظام سے فقہ حنفی کو خارج کر کے برطانوی قوانین نافذ کر دیے گئے، جس سے ہماری تعلیمی ضروریات دو حصوں میں منقسم ہو گئیں۔ دفتری اور عدالتی نظام میں شرکت کے لیے انگریزی تعلیم ناگزیر ہو گئی اور دینی و قومی ضروریات کے لیے درس نظامی کے سابقہ نظام کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا گیا، جبکہ مدارس و مکاتب کا سابقہ نظام ختم کر دیا گیا۔ علماء کی ایک بڑی تعداد جنگ آزادی میں کام آگئی، باقی ماندہ میں سے ایک کھپ کلا پانی اور دیگر جیلوں کی نذر ہو گئی اور بچے رہ جانے والے لوگ شکست کے اثرات کو سمیٹتے ہوئے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں مصروف ہو گئے۔ مدارس و مکاتب کے لیے مغل حکمرانوں کی عطا کردہ جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے کا تعلیمی نظام مکمل طور پر تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

نئے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی ضروریات کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد اہل دانش نے مستقبل کی طرف توجہ دی۔ سرسید احمد خان مرحوم نے ایک محاذ سنبھال لیا اور دفتری و عدالتی نظام میں مسلمانوں کو شریک رکھنے کے لیے انگریزی تعلیم کی ترویج کو اپنا مشن بنا لیا، جبکہ دینی و قومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے دینی تعلیم کا محاذ فطری طور پر علماء کرام کے حصہ میں آیا اور اس سلسلہ میں سبقت اور پیش قدمی کا اعزاز مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے کالج کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دونوں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد تھے اور دونوں نے مختلف سمتوں پر تعلیمی سفر کا آغاز کیا جو آگے چل کر دو مستقل تعلیمی نظاموں کی شکل اختیار کر گئے۔ ابتداء میں سرسید احمد خان مرحوم کے ادارے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مدرسہ عربیہ

دونوں کی بنیاد عوامی چندہ پر اور امداد باہمی کے طریق کار پر تھی، لیکن بعد میں کالج اور اسکول کے نظام کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی اور رفتہ رفتہ پورا نظام سرکار کی تحویل میں آکر مصارف و اخراجات کے منجھٹ سے آزاد ہو گیا، جبکہ دینی مدارس سرکاری سرپرستی سے آزاد رہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے اخراجات و ضروریات کے لیے ہر دور میں عوامی چندہ پر انحصار کرنا پڑا اور آج بھی یہ صورت حال بدستور قائم ہے۔

دینی مدارس کے اس آزادانہ اور متوازی نظام کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے:

○ — قرآن و سنت، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی حفاظت اور مسلم معاشرہ کا ان سے تعلق برقرار رکھنا۔

○ — مساجد و مدارس کے نظام کو قائم رکھنا اور ان کے لیے ائمہ، خطباء اور مدرسین کی فراہمی۔

○ — یورپ کی نظریاتی اور تہذیبی یلغار کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی طرز معاشرت اور عقائد کی حفاظت۔

○ — جدید عقلیت کے پیدا کردہ اعتقادی و نظریاتی فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ یہ مدارس سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ایسا تعلیمی نصاب و نظام اختیار کریں کہ اس کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانہ میں فٹ ہو سکیں۔ اس بات کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنا۔ ان کی روایت کے مطابق یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فرزند مولانا حافظ محمد احمدؒ تھے۔ اس دور میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل کچھ نوجوان، حیدرآباد دکن کی ریاست میں ملازمتوں پر فائز ہوئے اور کارکردگی اور صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے ملازمین سے بہتر ثابت ہوئے۔ مولانا حافظ محمد احمدؒ کے دورہ حیدرآباد کے موقع پر نظام حیدرآباد نے ایک ملاقات میں ان سے اس بات کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ہر سال سارے کے سارے حیدرآباد بھجوا دیے جائیں تو نظام حیدرآباد انہیں ملازمتیں دیں گے اور دارالعلوم کے سالانہ اخراجات کا بار، نظام خود اٹھائیں گے۔ مولانا حافظ محمد احمدؒ نے دیوبند واپسی پر یہ پیش کش دارالعلوم کے صدر مدرس شیخ المنہ مولانا محمود حسنؒ کے سامنے بیان کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مولانا محمود حسنؒ نے خود کوئی مشورہ دینے کی بجائے مولانا حافظ محمد احمدؒ کو اس کی خدمت

میں بھیج دیا جو اس وقت بقیہ حیات تھے۔ انہوں نے مولانا حافظ محمد احمدؒ سے نظام حیدر آباد کی پیش کش کے بارے میں سن کر جو جواب دیا وہ حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ صاحب کے الفاظ میں یوں تھا:

”بھائو میں جائے حیدر آباد کی ریاست! ہم اس ریاست کو چلانے کے لیے طلبہ کو نہیں پڑھا رہے۔ ہم تو اس لیے پڑھاتے ہیں کہ مسجدیں اور قرآن کے مکاتب آباد رہیں اور مسلمانوں کو نمازیں اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور استاذ ملنے رہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا اور علماء اور دینی طلبہ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا رہا، کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے افراد لازماً ”سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی کھپ بھی اسی طرف منتقل ہو جاتی جس سے دینی مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا۔ جبکہ دینی مدارس کے نظام کا آغاز کرنے والوں کے ذہن میں سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایسی کھپ تیار ہو جو قرآن پاک کے مکاتب کو آباد رکھے، اس لیے حکمت عملی کے تحت عملاً ”ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حوالے سے یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ اس کے نتیجے میں برصغیر کے طول و عرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا اور مساجد میں ائمہ و خطباء کی کھپ بھی فراہم ہوتی رہی۔

دینی مدارس کے منتظمین نے ان مقاصد کے حصول کے لیے کیا کیا جتن کیے؟ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیلات کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے سولتوں کی زندگی ترک کر کے فقر و فاقہ اور تنگی و ترشی کی زندگی اختیار کی، لوگوں سے صدقات و خیرات مانگ کر مدارس کو آباد رکھا۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو محلہ کے ایک ایک گھر سے روٹیاں مانگنے کا سلسلہ بھی قائم رہا، اس لیے یہ بات بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے اپنی ”عزت نفس“ تک کی قربانی دے کر معاشرہ میں قرآن وحدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد و معاشرت کو برقرار رکھا۔ ورنہ عالم اسباب میں اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اسپین کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی (نعوذ باللہ) اسلام ایک قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔ صدقہ و خیرات، گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار کی نظریاتی، فکری اور تمدنی لحاظ سے مغرب کے مقابل میں مسلمانوں کی عظیم کامیابی ثابت ہوا اور

اس نظام نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے عقائد و افکار، معاشرت اور اسلامی علوم و فنون کی حفاظت کی بلکہ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو نظریاتی راہ نماؤں اور کارکنوں کی کھپ بھی فراہم کی جس میں مولانا محمود حسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الجبار بدایونی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ہزاروں رفقاء بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دور غلامی میں دینی مدارس کی حکمت عملی دفاعی تھی جس کے لیے انہیں بہت سے تحفظات اختیار کرنے پڑے۔ اور اگر وہ ان تحفظات کے بارے میں سختی اختیار نہ کرتے تو اپنے بنیادی مقاصد کی طرف اس قدر کامیابی کے ساتھ پیشرفت نہ کر پاتے، لیکن قیام پاکستان کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہو گئی اور آزادی کے حوالہ سے نئے تقاضے اور ضروریات سامنے آ گئیں جن کے بارے میں دینی مدارس کی تمام تر مجبوریوں اور مشکلات کے باوجود بہر حال یہ کہنا پڑتا ہے کہ نئی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے مقاصد میں شامل کرنے کے لیے وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئے جس کے نقصانات قومی سطح پر بہت دیر تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج و تحفظ کی ذمہ داری ریاستی نظام تعلیم کے سپرد کر دی جاتی اور دینی مدارس کے الگ نظام کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لیکن ریاستی نظام تعلیم نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ریاستی نظام تعلیم نے تو قیام پاکستان کے بعد آزادی اور ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کے حوالہ سے اس قدر مایوس کیا کہ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری تھی کہ وہ:

○ — پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دینے اور ایک فلاحی اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے فوج، بیورو کریسی، عدلیہ اور دیگر قومی شعبوں میں اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور افراد کار میا کرے۔

○ — معاشرہ کے عام افراد کو قرآن و سنت کی ضروری تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرے۔

○ — مساجد اور دینی مکاتب کا نظام چلانے کے لیے ائمہ اور مدرسین کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کرے۔

○ — اسلامی تعلیمات و احکام کو عالمی برادری کے سامنے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرنے کے لیے کارکنان کا تیار کرنا اور انہیں اسلامی علوم و فروع کے چیلنج کا سامنا

کرنے کی تربیت دیتا۔

لیکن ریاستی نظام تعلیم نے نہ صرف یہ کہ ان ذمہ داروں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ عملاً یہ نظام سیکولر اور اسلام مخالف عناصر کی کمین گاہ ثابت ہوا اور پاکستان میں اسلامی احکام و تعلیمات کی ترویج کو روکنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو غیر موثر بنانے میں اس نظام تعلیم نے مضبوط مورچے کا کام دیا۔ جبکہ اس کے برعکس دینی مدارس نے جو ذمہ داریاں ۱۸۵۷ء کے بعد قبول کی تھیں، ان پر وہ اب بھی پوری دل جمعی کے ساتھ گامزن ہیں اور ان کے طریق کار اور دائرہ عمل میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوا بلکہ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی علوم کی حفاظت و ترویج اور مساجد و مدارس کے لیے ائمہ و اساتذہ کی فراہمی کے لیے دینی مدارس کے کردار کا تسلسل کسی خلا اور تعطل کے بغیر بدستور قائم ہے تو ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ تقابل کے تناظر میں دینی مدارس کا یہ کردار بڑے سے بڑے قوی اعزاز کا مستحق ہے، کیونکہ آج بھی ان دو مقاصد کے حوالے سے معاشرہ کی ضروریات یہی دینی مدارس پوری کر رہے ہیں اور اگر دینی مدارس اپنا یہ کردار چھوڑ دیں تو مساجد و مدارس کے لیے ائمہ و اساتذہ کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج و حفاظت کے شعبہ میں جو خلا واقع ہو گا وہ کسی باشعور شہری کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

دینی مدارس کے موجودہ کردار اور خدمات کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں، لیکن ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے۔

دینی مدارس سے سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی، ریاضی، سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ شکایت ایسی ہے جسے نہ تو پوری طرح قبول کیا جاسکتا ہے اور نہ مسترد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جہاں تک عصری علوم کی مکمل تعلیم کا سوال ہے وہ نہ تو دینی تعلیم کے نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل کی جاسکتی ہے اور نہ ایسا کرنا ضروری ہی ہے۔ شامل اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ مستند اور پختہ عالم دین کا مقام حاصل کرنے کے لیے فارسی و عربی، صرف و نحو، قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، معانی و ادب اور منطق و فلسفہ جیسے ضروری علوم کا ایک مکمل نصاب ہے جسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی شخص ”عالم دین“ کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر اس نصاب میں کمی کی جائے تو دینی علوم میں مہارت کا پہلو تیشہ رہ جاتا ہے۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ یہ تعلیمات اور اساتذہ کی فراہمی کے لیے الگ ماہرین

تیار ہوتے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے ماہر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ مثلاً "کسی انجینئر کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس کے علم سے بہرہ ور ہو اور کسی ڈاکٹر کے لیے ضروری نہیں کہ اس نے انجینئرنگ کا علم بھی حاصل کر رکھا ہو۔ اسی طرح کسی عالم دین کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس، انجینئرنگ یا کسی شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ تاہم ایک فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک کسی شعبہ میں پوری مہارت اور مکمل تعلیم کا تعلق ہے، وہ تو کسی دوسرے شعبہ کے فرد کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن بنیادی اور جہل معلومات ہر شعبہ کے بارے میں حاصل ہونی چاہئیں اور اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر کے لیے دین کا مکمل عالم ہونا ضروری نہیں مگر دین کی بنیادی معلومات و مسائل سے آگاہی ان کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ اپنے شعبہ میں دینی احکام کے دائرہ کو ملحوظ رکھ سکیں، اسی طرح ایک عالم دین کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر ہونا ضروری نہیں البتہ ان شعبوں کے بارے میں بنیادی معلومات علماء کو ضروری طور پر حاصل ہونی چاہئیں تاکہ وہ ان شعبوں کے افراد کی دینی راہ نمائی صحیح طور پر کر سکیں۔ اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔ اس لیے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے کماحقہ بہرہ ور ہونا علماء کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس، جہل سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں اور دینی مدارس کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔

اس سلسلہ میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً "ان کی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کی بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے جس کی وجہ سے مساجد و مدارس کو ضرورت اور معیار کے مطابق ائمہ، خطباء اور مدرس میسر نہیں آتے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مروجہ معیار کسی طرح بھی اس درجہ کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے، اس لیے جسے سرکاری ملازمت میں جانے کا راستہ مل جاتا ہے وہ لازماً ادھر" ادھر" جاتا ہے اور

خلاء کا مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر جائے گا۔ اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ ایک گفتگو کا حوالہ دینا شاید نا مناسب نہ ہو۔ یہ اس دور کی بات ہے جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے بعد ضلع اور تحصیل کی سطح پر شرعی قاضی مقرر کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور قاضی کورس کے لیے آرڈی نینس کے نفاذ کی تیاری ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب راول پندی کینٹ کے ملٹری ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ پاکستان بھر میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر مقرر کرنے کے لیے اس قدر تربیت یافتہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ اگرچہ اس زمانے میں بعض دینی اداروں نے قانیوں کی تربیت کے لیے چار ماہ یا چھ ماہ اور ایک سال کے کورس شروع کر رکھے تھے، لیکن میں ان سے مطمئن نہیں تھا کہ قاضی بہر حال قاضی ہوتا ہے اور سال چھ ماہ کا کورس کسی شخص کو قاضی نہیں بنا سکتا اور اگر ہم نے پاکستان میں قاضی کورس کا آغاز اس طرح کے نیم قانیوں سے کیا تو اسلام کے عدالتی نظام کا پہلا تاثر ہی اپنے نتائج کے لحاظ سے نقصان کا باعث بن سکتا ہے، چنانچہ میں نے مولانا مفتی محمود سے سوال کیا کہ حضرت! یہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ جن مدرسین نے دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح تک کتابیں چار پانچ سال پڑھائی ہیں وہ نظام قضا کے مختصر کورس کے بعد قضا کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں، لیکن پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ ضلع اور تحصیل کی سطح پر قاضی مقرر کرنے کے لیے پاکستان کے اضلاع اور تحصیلوں کی تعداد کے مطابق اس سطح کے مدرسین مل جائیں گے یا نہیں اور اگر ہمارے پاس اتنی تعداد میں اس معیار کے مدرسین مل بھی جائیں تو انہیں عدالتوں میں بھیج کر دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح کی کتابیں کون پڑھائے گا؟ اس سوال کا جواب حضرت مفتی محمود صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ٹال دیا۔ لیکن میں نے ان کے چہرے کی سلوٹوں سے اندازہ لگا لیا کہ اس سوال نے خود انہیں بھی پریشان کر دیا ہے۔

دینی مدارس کو ابھی تک اپنے وجود کے تحفظ اور اپنے کردار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظات کی فضا کا سامنا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی تیار کردہ کھپ کو دوسرے شعبوں کے حوالے کر کے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس لیے اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسہ تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے۔

امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دینے والے افراد میں مستند و غیر مستند کا تناسب کیا ہے؟ اگر اس کا غیر جانبدارانہ سروے کیا جائے تو غیر مستند ائمہ و خطباء کا تناسب مستند حضرات سے کہیں زیادہ ہوگا اور ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے، جس کی طرف اکثر حضرات کی توجہ نہیں ہے اور جو اہل دانش اس کا ادراک رکھتے ہیں وہ کسی فتوے کی زد میں آجانے کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے ناطے سے اسٹیٹ کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح دوسرے شعبوں میں ان کو ایفائیڈ افراد کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کو ایفائیڈ افراد کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے، امامت و خطابت اور دینی تعلیم کے شعبہ میں بھی ان کو ایفائیڈ افراد کا تناسب کم سے کم کرنے اور بالآخر اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے اور جس طرح ملک میں خواندگی کا تناسب بستر بنانے کے لیے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایک معقول بجٹ اس کام کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے، دینی شعبہ میں کو ایفائیڈ افراد کا تناسب پڑھانے کے لیے دینی مدارس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور قومی تعلیمی بجٹ میں ان کے لیے معقول حصہ مختص کیا جائے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ یہ کام اگرچہ اصلاً "ریاستی نظام تعلیم کا تھا لیکن ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ریاستی نظام تعلیم نے اس سمت سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور اس کے بعد اس خلاء کو پر کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں بہر حال دینی مدارس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا از سر نو جائزہ لے کر اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث و فقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے اور اس کے ساتھ اگر تجارت، عدالت، انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انہیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کر لیا جاتا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج معاشرہ میں فکری انتشار اور اخلاقی انحطاط کی صورت میں سامنے آ رہے ہیں۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت اسلام کے پالنے میں مہربانیوں اور ورلڈ میڈیا کے

مسی پر ایگزٹھ کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظر انداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر، جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی قراردادوں اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالہ سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جا رہا ہے۔ ارتداد اور توہین رسالت پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادی رائے کے بنیادی حق سے متصادم کہا جا رہا ہے اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرہ کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے اور آج کی زبان میں اسلام کو انسانی حقوق کے علمبردار اور محافظ نظام کے طور پر پیش کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں دینی مدارس اور اداروں کی طرف اٹھتی ہیں اور عام مسلمان یہ توقع کرتا ہے کہ جس طرح دینی مدارس کے نظام نے برطانوی استعمار کے دور میں اعتقادی اور معاشرتی فتنوں کا دل جسی سے مقابلہ کیا تھا، آج بھی وہ مغربی فلسفہ کی نئی اور تازہ دم یلغار کے سامنے خم ٹھونک کر میدان میں آئے گا، مگر چند استثنائوں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضا ہی سرے سے موجود نہیں جو بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو اور مباحثہ کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا۔ فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر و محراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے والے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان دونوں اجنبی ہو چکے ہیں مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کی زبان منطق و استدلال کی زبان ہے، مشاہدات کی زبان ہے، کسی بھی مسئلہ کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے، مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے نا آشنا ہے اور ستم بالائے ستم کہ اچھا بولنے اور اچھا لکھنے والوں کا تناسب جو دینی حلقوں میں پہلے ہی بہت کم تھا، مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ انگلش اور عربی تو رہی ایڈ، طرف، اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں، ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سرنو لکھنا پڑے، اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی تربیت کا جو ماحول چھ عرصہ پہلے تک ان مدارس میں قائم رہا ہے، وہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور گنتی کے چند اداروں کے سوا دینی مدارس کی اکثریت ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری، دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبہ کے طور پر کوئی واضح اور متعین مقصد زندگی نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی اور اس کے نقصانات بھی قدم قدم پر سامنے آرہے ہیں۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و مشاورت کا نظام انتہائی کمزور ہے۔ پہلے تو بالکل نہیں تھا مگر کچھ عرصہ سے تمام مذہبی مکاتب فکر کے مدارس نے اپنے اپنے وفات کر لیے ہیں جو اگرچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہیں لیکن اپنے اپنے کتب فکر کی حد تک انہوں نے باہمی ربط کا ایک نظام قائم کر لیا ہے جس سے امتحانات کی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور کچھ دیگر فوائد بھی سامنے آئے ہیں، لیکن معاشرہ میں دینی مدارس کی کارکردگی اور اثرات کا دائرہ جس قدر وسیع ہے اس کے مطابق موجودہ ربط و نظم قطعی طور پر ناکافی ہے، جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔ جہاں جس کا جی چاہتا ہے ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے اور چونکہ اوپر چینگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے، اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اس کے منظور نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ ان خود رو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کی بجائے ”مذہبی دکانیں“ کھلانے کے زیادہ حق دار ہیں اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔ ضیاء الحق مرحوم کے دور میں سرکاری زکوٰۃ کا ایک حصہ دینی مدارس کے لیے مخصوص کیا گیا تو اس کے حصول کے لیے دنوں میں کئی مدرسے وجود میں آ گئے اور پھر سرکاری زکوٰۃ کی رقم حاصل کرنے کے لیے رشوت، سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے، انہوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری حکموں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ میں وہ معیاری دینی ادارے ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ کی وصولی سے گریز کیا اور اپنی چادر کے دائرے میں پاؤں پھیلانے کے باوقار طریق کار پر گامزن رہے۔ دوسرے نمبر پر وہ دینی ادارے ہیں جو اپنی کارکردگی اور معاملات میں دیانت اور اعتماد کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور انہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول کر کے اسے صحیح مصرف پر صرف کیا۔ اور تیسرے نمبر پر وہ مدارس ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے

میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا۔ بد قسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں تیسری قسم کے مدارس کی فہرست زیادہ لمبی ہے اور دینی مدارس کے مجموعی نظام کے بارے میں سرکاری محکموں کی رائے قائم ہونے میں یہی فہرست بنیاد بن رہی ہے۔ پھر چند بڑے اور معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر دینی مدارس نے عوامی چندہ کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصہ سے اختیار کر لیے ہیں، انہوں نے چندہ دینے والے اصحاب خیر کو پریشان کر دیا ہے اور اس سے مدارس کی نیک نامی اور اعتماد مجروح ہو رہا ہے۔ کراچی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران مساجد اور دکانوں پر دینی مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں کہ کاروباری شہروں میں بہت سے دکاندار رمضان المبارک کے دوران سفیروں کی یلغار کے خوف سے خود اپنی دکانوں پر بیٹھنے سے کترانے لگے ہیں اور مساجد میں نمازوں کے بعد کھڑے ہو کر اپیل کرنے والے سفیروں کو اب نمازیوں نے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے مدارس کے سفراء نماز کے بعد کھڑے ہو کر اپنے مدرسے کے لیے اپیل کرتے ہیں اور پھر دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں، جہاں نمازی گزرتے ہوئے پاؤں اور کتے پھینکتے جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظرس شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل جنگ لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا، جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلٹے پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطباء کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں ان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسہ کا سفیر چندہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال برطانیہ کی مساجد کی ہے جو ہزاروں میل دور اور اکثر مدارس کے سفراء کی دسترس سے باہر ہے۔ جب وہاں کا یہ حال ہے تو اپنے ملک کی مساجد کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ اور قیاس کرنے کی ضرورت کیا ہے، سارا منظر تو ہم رمضان المبارک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ لوگ دینی مدارس سے تعاون نہیں کرتے، اس لیے مدارس کو مجبوراً ایسے طریقے اختیار کرنے پڑے ہیں جو انہیں دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دے۔

ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کا سالانہ بجٹ لاکھوں سے متجاوز ہے اور بعض کا کروڑوں کی حدود میں قدم رکھ رہا ہے، وہ مدارس نہ سرکاری اور نہ ہی ان کے سفیر اس طرح چندہ کے لیے گھومتے پھرتے ہیں، مگر ان کا بجٹ صاحب خیر مسلمانوں کے تعاون سے باوقار طریقہ سے فراہم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے دینی مدارس کا ماضی اور حال جسے اب پاکستان کی وزارت داخلہ اور اس سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر اینٹی انٹرنیشنل اپنی تحقیقات اور سروے کی بنیاد بنا کر دنیا کو ان کی منفی تصویر دکھانے کے درپے ہے۔ اینٹی انٹرنیشنل کا تو یہ نظریاتی محاذ ہے، وہ مغربی حکومتوں اور لابیوں کی نمائندہ ہے جن کا موقف یہ ہے کہ اسلام آج کے دور میں بطور ”نظام زندگی“ قابل عمل نہیں ہے اور اسلامی احکام و قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں، اس لیے عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات کو ناکام بنانا ضروری ہے، ورنہ قرون وسطیٰ کا وحشیانہ دور پھر واپس آسکتا ہے جس سے ویسٹرن سولائزیشن اور تہذیب و ترقی سب کچھ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے مغربی حکومتیں اور ان کے مفاد میں کام کرنے والی لائیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کے سرچشموں کو بند کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی نظر میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا بنیاد پرست مسلمان ملک ہے اور پاکستان کی بنیاد پرستی کا سرچشمہ دینی مدارس ہیں، اس لیے دینی مدارس کو غیر موثر بنانا اور عوام کے ساتھ ان کے اعتماد کے رشتے کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر علماء کرام اور دینی مدارس کی کردار کشی اور انہیں منتشر رکھنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ اینٹی انٹرنیشنل اسی مہم کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے اور پاکستان کے غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کو بنیاد بنا کر ایک رپورٹ دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں دکھایا جائے گا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے، انہیں مارا جاتا ہے، زنجیروں سے باندھا جاتا ہے، ان سے جبری بیگاری جاتی ہے، ان کی خوراک، رہائش اور صفائی کا معیار ناقص ہے، انہیں ان مدارس میں آزادی رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، انہیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبے میں کھپ نہ سکیں۔ ان کے نام پر چندہ کر کے مدارس کے منتظمین کھاپی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی تنگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحہ کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اینٹی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کا حصہ ہو گا جو اگلے سال جون تک منظر عام پر آ رہی ہے اور اس کے لیے بطور خاص ایسے غیر معیاری مدارس کو سروے کی بنیاد بنایا جا رہا ہے جہاں سب کچھ ہوتا ہے تاکہ رپورٹ پر ”غیر حقیقت پسندانہ“ اور ”خطا واقعہ“ ہونے کا الزام عائد نہ کیا جاسکے۔ اس سروے مہم میں اینٹی

انٹرنیشنل کی کوئی ٹیم معیاری دینی مدارس میں نہیں جائے گی اور نہ ہی رپورٹ میں ان کا تذکرہ ہوگا۔ پاکستان کی وزارت داخلہ اور دیگر محکمے اس مہم میں اینسٹی انٹرنیشنل کے معاون ہیں اور دینی مدارس کے خلاف اس مہم میں ان کے مقاصد بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔

کسی بھی طبقہ کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے ٹالان قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقیوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہونا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا، ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پراپیگنڈہ مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ: —○ تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعہ کنٹرول کیا جائے۔

○ — درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔
○ — گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

○ — اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔
○ — مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

○ — اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

○ — دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔

○ — مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرو مندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں وفاقیوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

○ — اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش، خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور اساتذہ کی کامیابی کا اصول قرار دیا جائے۔

جائے۔

○ مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت، خدمات اور کردار کے حوالہ سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرما کر اصلاح احوال کی ضروری تدابیر اختیار کریں گے تاکہ دینی مدارس کا یہ نظام ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی علوم کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مفید اور موثر کردار ادا کر سکیں۔
(”الشریعہ“ جنوری ۱۹۹۵ء)

خلافت راشدہ کے دور میں لازمی تعلیم کے اصول کا بھی سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے سفیان ثمالی ایک شخص کو چند آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اس کلام پر مامور فرمایا کہ وہ قبائل عرب کا دورہ کریں اور ہر مسلمان کا امتحان لیں۔ جس کو قرآن مجید یاد نہ ہو، اس کو سزا دیں۔ کنز العمال میں فاروق اعظمؓ کا یہ ارشاد گرامی درج ہے ”مسلمانوں کو بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور سورتیں سیکھنا لازمی ہیں، کیونکہ ان میں عملی زندگی کے بارے میں ضروری احکام مذکور ہیں“

اس دور میں روایت و حفظ کا طریق تعلیم بھی رائج تھا۔ چنانچہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں ”۲۵ ہجری تک“ جب تک باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع نہ ہوئی تھی، جو تعلیم تھی وہ عرب کے ساتھ اور نیچل طرز زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم دو تھے جن کا حافظے سے زیادہ تر تعلق تھا۔ دینی مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا یعنی سند و روایت جو قدیم زمانے میں رائج تھا۔“

رفتہ رفتہ املا، تحریر و کتبت کا رواج بھی بڑھنے لگا جس کی ابتدا اعمد نبویؐ میں ہو چکی تھی۔ کتبت قرآن اور کتبت حدیث پر خاص توجہ دی گئی۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے بارے میں ٹھوس شواہد ملتے ہیں کہ انہوں نے احادیث کے صحیفے مرتب کیے اور شہرت دوام پائی۔

(دور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم اعمد نبویؐ و عمر فاروق حسن)